© rasailojaraid.com

مذہب اور تجدیدِ مذہب

(۴)

مذہبی بگاڑ کی مختلف صورتیں اور اس کے اسباب

عبد الحمید صاحب صدیقی

مذہب کو مجرد روحانی کیف و مستی کا مترادف سمجھنے اور ذاتِ مطلق میں انسانی روح کے ادغام کو مذہب کا منتہائے مقصود ٹھیرانے کے لیے روحانیت کے پرستاروں کو ذاتِ مطلق کے بارے میں عجیب و غریب نظریات گھڑنے پڑے۔ وہ شخص جو کسی الہامی مذہب کے مبادیات سے بھی واقف ہے وہ اس حقیقت کو پوری طرح جانتا ہے کہ مذہب کی ساری عمارت بعض ایسے بنیادی حقائق پر استوار ہے جن کی صحت پر انسانی عقل و فہم پوری طرح گواہ ہے لیکن وہ حقائق انسان کی سرحدِ ادراک سے ماورا ہیں اور انہیں سمجھنے کے لیے ہمیں لامحالہ قادرِ مطلق کے اُن "فرستادوں" پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جو بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کے لیے اُس ذاتِ برحق نے بھیجے ہیں۔ چونکہ منشائے الٰہی ہمیں براہِ راست معلوم نہیں ہو سکتا اور اس کے لیے ہم ایک واسطے کے لازماً محتاج ہیں، اس لیے ہر الہامی مذہب میں ایمان بالغیب کو ہمیشہ ایک بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ایک انسان اور اُس کے مالک کے درمیان جتنے حجابات حائل ہیں وہ اگر اٹھا لیے جائیں اور حقیقت پوری طرح بے نقاب ہو کر ہماری آنکھوں کے سامنے جلوہ افروز ہو تو پھر انبیاء علیہم السلام کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ کے یہ پاکباز بندے اسی لیے تو مبعوث فرمائے جاتے ہیں کہ ہم ان حجابات کے پیچھے مستور حقیقتوں کو دیکھنے پر قادر نہیں ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسری طرف انسان کا دل مشاہدۂ حق کے لیے ہمیشہ بے تاب رہتا ہے اور اس بات کی آرزو کرتا ہے کہ کسی طرح حقیقتِ منتظر اپنا حجاب اٹھا کر اس کے سامنے جلوہ افروز ہو۔ اس کی معقول صورت تو یہ تھی کہ انسان اس مشاہدہ کے لیے اُس وقت تک انتظار کرتا جب تک کہ اُسکی رُوح پیکرِ خاکی سے آزاد ہو کر بارگاہِ الٰہی میں حاضر نہ ہو اور اس عرصے میں اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے روحانی اور اخلاقی ضابطۂ حیات کے مطابق اس کی تربیت کرتا رہتا تاکہ وہ پاک اور منزہ ہو کر اُس کے حضور میں پیش ہو۔ مگر انسان کی بے تابی نے مشاہدۂ حق کے لیے حیاتِ مستعار کی چند گھڑیوں کے لیے بھی انتظار کرنا گوارا نہ کیا اور اس پیکرِ خاکی کے ساتھ ہی اپنی روح کو روحِ مطلق کے ساتھ ہم آغوش کرنے کی ناکام کوشش کی۔ چونکہ یہ ایک اَن ہونی بات تھی اس لیے اُس نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں۔ روحانیت پرستوں کی مخالفت کا سب سے بڑا ہدف غیب کے وہ پردے ہیں جن پر ایمان کا سارا دار و مدار ہے۔ چونکہ ان حضرات کے نزدیک مذہب کی غایت صرف روحانی کیف و سرور ہے اور یہ گوہرِ مقصود مشاہدۂ حق کے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اس بنا پر انہوں نے یہ ضروری سمجھا کہ خالقِ کائنات نے عابد و معبود کے درمیان غیب کے جتنے پردے حائل کر رکھے ہیں انہیں ہٹا یا جائے تاکہ حقیقت بے نقاب ہو کر اُن کے سامنے آجائے۔

غیب کے یہ پردے، فطرت اور مذہب کے نہایت اہم اجزا ہیں۔ اگر انہیں درمیان سے ہٹا دیا جائے تو مذہب کی پُوری عمارت پیوندِ خاک ہو جاتی ہے۔ خالقِ کائنات اور انسان کے درمیان حجابات حائل ہونے ہی کی وجہ سے انسان کے دل میں ذات برحق کو سمجھنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ اسی امنگ کی وجہ سے وہ ان ذرائع کی جستجو کرتا ہے جن سے وہ اس کی معرفت حاصل کر سکے۔ اور پھر وہ اپنی اسی امنگ کو پُورا کرنے کے لیے ان مقدس نفوس کی طرف رجوع اور ان پر اعتماد کرتا ہے جنہیں ذات برحق کی پُوری معرفت حاصل ہے۔ زندگی کے اس طرف، عالمِ ناسوت میں انسان کا مطالعہ و مشاہدہ، خواہ اس کا تعلق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اَنفُس سے ہو یا آفاق سے، انسان کے علم کی سرحدوں کو بلاشبہ وسیع کر دیتا ہے۔ لیکن ان نئی سرحدوں پر کھڑے ہو کر عقلِ سلیم رکھنے والے انسان کے اندر کبھی مغرورانہ احساس پیدا نہیں ہونے پاتا، کہ اس نے انفس و آفاق کے سارے گوشوں کا اچھی طرح ادراک کر لیا ہے۔ بلکہ اس مقام پر پہنچ کر وہ

معلومم شد کہ ہیچ معلومم نیست

کہہ کر حیرانی کے عالم میں گم ہو جاتا ہے۔

عالمِ غیب کے معاملے میں انسان کی اس بے بسی اور بیچارگی کا تقاضا یہ تھا کہ انسان نہ تو کائنات کے تھوڑے سے علم پر اِتراتا اور نہ مشاہدۂ باطن کی چند جھلکیوں پر نازاں ہوتا۔ لیکن ان دونوں گروہوں نے اس راہ میں عجیب و غریب لغزشیں کھائیں۔ کائنات کا جائزہ لینے والوں نے خالق کی صنعت گری کے نمونے دیکھ کر اس کی قدرتِ کاملہ پر ایمان لانے کے بجائے اپنے آپ کو محسوس اور مادی دنیا کے خم و پیچ میں الجھا دیا اور اس غلط فہمی میں گرفتار ہو گئے کہ مادہ کی یہ محدود دنیا ہی اس کائنات کی، یعنی خود اپنی اصل خالق ہے، کسی اعلیٰ و ارفع اور صاحبِ ارادہ ذات کے تدبّر اور حکمتِ بالغہ کی کرشمہ سازی نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح مشاہدۂ باطن سے روحانی کیف و سرور حاصل کرنے والوں نے کشف کی چند تجلیات کو ہی اصل چیز سمجھ لیا اور یہ سمجھنے لگے کہ انہوں نے وہ مقامِ محمود حاصل کر لیا ہے جس کی انہیں تلاش تھی۔

خالق و مخلوق کے درمیان غیب کے جو پردے حائل ہیں انہیں دور کرنا چونکہ انسان کے بس میں نہیں ہے اس لئے اس نے مشاہدۂ حق اور اس کے ادراک کے لئے قادرِ مطلق کی صنعت گری کو اس ذات کا ایک جزوِ لاینفک سمجھ کر اپنے روحانی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرنے کی بیجا کوشش کی اور اس ذوق نے مندرجہ ذیل صورتیں اختیار کیں۔

(ا) خالقِ کائنات چونکہ اپنی ذات کے لحاظ سے مستور رہے اس لیے ایک گروہ نے اپنے حاسۂ مذہبی کی تشفی کے لیے معبودِ حقیقی کی جگہ کچھ مادی پیکر تراش کر انہیں اپنا معبود بنا لیا اور پھر ان کے ساتھ عبدیّت کا تعلق استوار کیا۔ یہ پیکر ان کے نزدیک گو کائنات کے اصل خالق نہ تھے لیکن اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مظہر ضرور تھے ۔ ان کی موجودگی مذہب پرستوں کے لیے روحانی تسکین کا سب سے موثر ذریعہ تھا ۔ انہوں نے سمجھا کہ ایک ان دیکھے خدا سے رابطہ قائم کرنے کے بجائے ان بتوں کے ذریعہ حقیقتِ کبریٰ کا محسوس شکل میں ادراک آسانی سے کیا جا سکتا ہے ۔ اس طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو اپنا کر وہ یہ سمجھتے تھے کہ پردۂ غیب کی تاریکیاں دور ہو سکتی ہیں اور ان کے روحانی کیف و سرور میں اضافہ ممکن ہے ۔

(ب) مٹی اور پتھر کے بتوں کے علاوہ روحانیت کے بعض علمبرداروں نے اشجار پرستی، کواکب پرستی، اور دوسرے مظاہر قدرت کی پرستش کا مسلک اختیار کیا ۔ قدرت کے ان رنگا رنگ مظاہر کی پرستش کے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما تھا کہ عابد و معبود کے درمیان غیب کے جو پردے حائل ہیں انھیں درمیان سے ہٹا کر حقیقت سے براہِ راست تعلق پیدا کیا جائے، تاکہ انسان روحانی سرور سے زیادہ سے زیادہ لطف اٹھا سکے ۔ اس طرزِ فکر کا آغاز بھی ایک صحیح احساس سے ہوا تھا ۔ مناظرِ فطرت اور حسنِ قدرت نے انسان کے اندر ہمیشہ ایک ایمانی کیفیت پیدا کی ہے ۔ اور اس نے فطرت کے جمال میں حسنِ ازل کی جھلک دیکھنے کی کوشش کی ہے ۔ پہاڑوں اور جنگلوں کی خاموش گویائی نے پکار پکار کر اسے ایک وجود کی طرف متوجہ کیا ہے ۔ سورج کی خشمگین کرنوں میں، چاند کی ٹھنڈک میں، صبح کی صباحت اور شام کی ملاحت میں اصحاب بصیرت کو ہمیشہ آیات الٰہی نظر آتی ہیں ۔ دنیا کے سارے مذاہب نے انسان کے اس فطری احساس کو ابھارا ہے لیکن اس صحیح جذبے نے ایک غلط اثر کے تحت بہک کر مظاہر پرستی کی شکل اختیار کر لی ۔ یہ مظاہر خالق کائنات کی صنعت گری کے نہایت ہی اعلیٰ اور نادر نمونے ہیں، اور اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ انہیں بنانے والی ذات بڑی قدرت، حکمت اور دانائی رکھتی ہے اور اس پورے نظام کو بڑے تدبر کے ساتھ چلا رہی ہے، لیکن روحانیت کے بے سمجھ علمبرداروں نے اور روحانی کیف و مستی کے جھوٹے دعویداروں نے ان مظاہر کو دیکھ کر " فتبارك الله احسن الخالقین " پکارنے کے بجائے ان کی پرستش شروع کر دی ۔ اس معاملے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو زبردست ٹھوکر انہوں نے کھائی اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہ تھی کہ وہ مظاہر کائنات کو خالق کی صنعت گری کے نمونے سمجھنے کے بجائے اُس ذاتِ حق کا لباسِ مجاز سمجھ کر اس پر فریفتہ ہو گئے اور چونکہ یہ مادّی اور محسوس مظاہر اُن کے لیے پردۂ غیب میں چھپی ہوئی حقیقتِ کُبریٰ کی بہ نسبت زیادہ روحانی کیف پیدا کر سکتے تھے اس لیے انہوں نے ان کی پرستش شروع کر دی اور آہستہ آہستہ اُس خالق سے رشتہ توڑ لیا جس کی صنعت اور کاریگری کے یہ نمونے تھے۔

(ج) بعض حضرات جو اُن دیکھے خدا پر ایمان لانے کے معاملے میں زیادہ محتاط تھے انہوں نے مظاہر پرستی کا شیوہ تو اختیار نہ کیا لیکن انہوں نے ان مظاہر کا باری تعالیٰ سے اس طرح کا تعلق قائم کر دیا جس سے کائنات اور خالقِ کائنات کو ایک دوسرے سے الگ نہ کیا جا سکتا تھا۔ وحدۃ الوجود اور ہمہ اوست کے تصورات اسی تعلق کے دو مختلف مظاہر ہیں۔ ان تصورات کے پیچھے جو عوامل کارفرما ہیں اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کی تہ میں بھی یہی ایک جذبہ کام کر رہا ہے کہ عابد و معبود کے درمیان غیب کے جو حجابات حائل ہیں انہیں کسی طرح دور کیا جائے اور حقیقتِ کبریٰ کا خود مشاہدہ کر کے اُس سے روحانی کیف حاصل کیا جائے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک امر کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ بعض لوگ وحدۃ الوجود (MONISM) اور ہمہ اوست (PANTHEISM) کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں میں بہت سی چیزیں مشترک اقدار کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دونوں تصورات ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہیں۔

وحدۃ الوجود کا اطلاق دو قسم کے نظریات پر ہوتا ہے۔ ایک وہ جو انسان کو صریح کفر کی طرف لے جاتا ہے اور دوسرا وہ جس کے پیچھے خدا کی قدرت اور برتری کا احساس کارفرما ہے۔ اگر ایک شخص یہ عقیدہ رکھے کہ "اس کائنات میں جو کچھ موجود ہے یعنی سورج، چاند، پہاڑ، اشجار، انسان اور حیوان وہی خدا ہے اور اس سے الگ کوئی برتر اور بزرگ ذات نہیں" تو یہ کفر ہے۔ فلاسفۂ مغرب میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس نظریے کا علمبردار مشہور مغربی مفکر اسپنوزا (م ۱۶۷۷ء) ہے۔[۱]

اہلِ مذہب نے اس نظریہ سے براءت کا اظہار کیا ہے اور اس کے مقابلے میں ایک دوسرا نظریہ پیش کیا ہے جو اُن کے نزدیک خالق کی عظمت اور اس کی برتری کا مظہر ہے۔ انہوں نے وحدۃ الوجود کی وضاحت کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ مادہ کی محدود دنیا باری تعالیٰ سے الگ اپنا کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی۔ خدا ہی اصلی اور حقیقی وجود ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ بقول غالب "حلقۂ دام خیال" ہے۔ اس ذاتِ برحق کو مختلف لوگوں نے مختلف ناموں سے یاد کیا ہے: مثلاً افلوطین اسے الواحد کہہ کر پکارتا ہے، شنکر اچاریہ اسے لفظ برہمن سے تعبیر کرتا ہے، شیخ محی الدین ابن عربی اسے الحق کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور ہیگل اسے روحِ مطلق سے تعبیر کرتا ہے۔

ذاتِ کبریٰ اور انسان کے مابین حجابات کو دُور کرنے کے لیے دوسرا جو نظریہ وضع کیا گیا اسے تصوّف کی زبان میں "ہمہ اوست" کہا جاتا ہے۔

پروفیسر ابراہام ولف نے اس کی مندرجۂ ذیل تعریف کی ہے:

"ہمہ اوست ایک ایسا متصوفانہ اور دینیاتی نظریہ ہے جس کے مطابق خدا ہی سب کچھ ہے اور سب کچھ ذات باری تعالیٰ ہے۔ یہ کائنات خدا سے الگ کوئی مخلوق نہیں بلکہ یہ کائنات ہی خدا اور خدا ہی کائنات ہے۔[۲]"

اس تعریف کے الفاظ میں مختلف مذاہب کے صوفیاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ یہ سارے حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ یہ کائنات اور اس میں جو صفات، افعال اور آثار ملتے ہیں، وہ بدونِ ذات ممکن نہیں اور انہیں کسی حالت میں ذات برحق سے جدا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی ہر صفت اور ہر فعل اور ہر اثر میں ذاتِ حق

۱؎ MYSTICISM & PHILOSOPHY BY W. T. STACE ص ۲۳۷

۲؎ ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA
دیکھیے مضمون PANTHEISM

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جلوہ گر اور کار فرما ہے۔ اسی حقیقت کو غالب نے شاعرانہ زبان میں یوں بیان کیا ہے :

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اس ضمن میں حافظ عبدالرحمٰن جامی کی صراحت بھی قابلِ غور ہے :

ہمسایہ و ہم نشین و ہمرہ اوست

در دلقِ گدا و اطلسِ شہ ہمہ اوست

در انجمن فرق و در نہانخانہ جمع

باللہ ہمہ اوست ثم باللہ ہمہ اوست

دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں مشاہدۂ حق سے کیف و سرور حاصل کرنے اور عابد و معبود کے درمیان حجابات کو ہٹانے کے لیے ہمہ اوست کا عقیدہ کسی نہ کسی شکل میں اختیار نہ کیا گیا ہو۔ ہندوؤں کے ہاں اس عقیدہ نے کس قسم کے احساسات کو ابھارا اس کا اندازہ اپنشدوں کے مندرجہ ذیل اشلوکوں سے لگایا جا سکتا ہے :

اے ذاتِ برحق، تم تو آگ ہو،

تم تو سورج ہو،

تم ہوا ہو

تم چاند ہو

تم ستاروں سے روشن فلک ہو،

تم برہمنِ اعظم ہو،

تم جل ہو،

تم فی الحقیقت ان ساری چیزوں کے خالق ہو[1]

---

[1] THE UPANISHADS TRANSLATED BY SWAMI PRABHAVANDA AND FREDREICK MANEHESTOR.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک مسیحی متصوف اپنے روحانی تاثرات کا ذکر کرتے ہوئے باری تعالیٰ کے ساتھ ہم آہنگی اور مطابقت کا یوں اظہار کرتا ہے:

"سینٹ پال کا قول ہے ہم ذات باری میں مسلسل تحلیل ہوتے رہتے ہیں۔ جب ایک شے دوسری میں مدغم ہو جاتی ہے تو ان دونوں کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ میں بھی خدا میں تحلیل ہو رہا ہوں اور وہ ذاتِ برحق مجھ سے ہم آہنگ ہو رہی ہے۔ قسم ہے اُس زندۂ جاوید خدا کی کہ اب مجھ میں اور خالقِ کائنات میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔ ہم اب دونوں ایک ہی ہیں۔

وہ آنکھ جس سے میں دیدارِ خداوندی سے لطف اندوز ہوتا ہوں، اُسی آنکھ سے وہ علیم و بصیر ذات میرا نظارہ کر رہی ہے۔ میری آنکھ اور خدا کی آنکھ دونوں ایک ہی ہیں[1]"

اسی ضمن میں ملّتِ اسلامیہ کے ایک معتقد صوفی اور وحدۃ الوجود کے نامور علمبردار شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی المتوفی ۶۳۸ھ کی تصریحات بھی ملاحظہ فرمائیں۔ وہ ایک مقام پر خالق و مخلوق کے باہمی تعلق کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حق تعالیٰ ہر شاہد میں سے شاہد ہے اور ہر مشہود میں سے مشہود ہے۔ یہ کائنات خالقِ کائنات کا پیکرِ محسوس ہے اور ذاتِ برحق اس کی روح اور اس کی مُدبّر۔"

اس نظریہ کی تصریح انہوں نے مندرجۂ ذیل اشعار میں بھی کی ہے:

فھو الکون کلہ وھو الواحد الذی

قام کونی بکونہ[2]

تمام وجود ایک ہی ہے۔ وہ ایک ہی ہے جس کے وجود سے میرا وجود قائم ہے۔

---

[1] یہ دونوں اقوال ایک مشہور فلسفی اور متصوف MEISTER ECHART کے ہیں۔ اس شخص کو قرونِ وسطیٰ میں بڑی شہرت حاصل رہی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے وعظ نمبر ۲۵ صہ ۲۱۳

[2] فصوص الحکم مرتبہ ابو العلاء عفیفی ص۱۱۱

© rasailojaraid.com

فانت عبدٌ وانت ربٌ   لمن له فیه انت عبدٌ

تو بندہ ہے اور تو رب سے جدا نہیں۔ کس کا بندہ؟ اس کا بندہ جس میں تو فنا ہوگیا۔

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر باری تعالیٰ، انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم تمہیں انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ دیکھنے والوں کو یہ حقیقت پوری طرح معلوم ہوجائے کہ ذات برحق ہی موجود حقیقی ہے۔ اس اعتبار سے تم اس کے مادی جسم ہو اور وہ تمہاری روح ہے۔[۲]"

شیخ محی الدین ابن عربی دنیائے اسلام کے پہلے صوفی اور فلسفی ہیں جنہوں نے نظریۂ وحدۃ الوجود کی صحت قرآن مجید اور سنت نبوی سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افکار نے مسلمان صوفیاء پر نہایت گہرے اثرات مترتب کیے ہیں۔ صدر الدین قونوی، مولانا رومی، حافظ عبدالرحمٰن جامی، شیخ عراقی، شاہ نظام الدین اورنگ آبادی، ملا بحر العلوم لکھنوی میں سے کوئی ایک بزرگ بھی ایسے نہیں جن کے نظریات پر شیخ اکبر کے تصورات کی گہری چھاپ نہ ہو۔ خالق کائنات اور کائنات کے باہمی ربط اور مشاہدۂ حق کے متعلق انہوں نے جو خیالات پیش کیے ہیں ان کی مسلمان صوفیاء نے بڑی پذیرائی کی۔ ان میں سے بعض بزرگوں نے ان خیالات سے تھوڑا بہت اختلاف بھی کیا ہے مگر اکثر حضرات نے ان کی ایسی توجیہات پیش کیں جن سے انہیں کتاب و سنت کے زیادہ سے زیادہ مطابق بنایا جاسکے لیکن ان سب حضرات کو دو باتوں پر ہمیشہ اتفاق رہا ہے۔ ایک یہ کہ انسان باری تعالیٰ کا مشاہدہ کرسکتا ہے اور اگر وہ اس معاملے میں ناکام ہے تو اس کی وجہ اس کی اپنی نظر کی کمزوری ہے۔ دوسرے یہ کائنات خالق کا لباس مجاز ہے۔

یہاں اس امر کی صراحت کردینا بھی ضروری ہے کہ بعض حضرات نے وحدۃ الوجود کے متعلق صوفیاء

---

[۱] فصوص الحکم مرتبہ ابوالفداء عفیفی ص ۹۲

[۲] ایضاً ص ۶۹

کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ مسلمان صوفیاء یہ نہیں کہتے کہ یہ "کائنات جلوۂ ذات ہے" بلکہ یہ کہتے ہیں کہ "جلوۂ ذات یہ کائنات ہے"۔ اس سے وہ اُس نازک فرق کو واضح کرنا چاہتے ہیں جو وحدۃ الوجود کے متعلق اسلامی اور غیر اسلامی تصورات کے درمیان پایا جاتا ہے۔ ان حضرات کا دعویٰ یہ ہے کہ جب ایک شخص یہ کہتا ہے کہ یہ کائنات جلوۂ ذات ہے تو اس سے کائنات کی ہستی کا اثبات ہوتا ہے جو کفر ہے۔ اس لیے وحدۃ الوجود کی صحیح اسلامی صورت یہ ہے کہ یہ کہا جائے: جلوۂ ذات یہ کائنات ہے" جس کا مطلب یہ ہے کہ جلوۂ ذات بسببِ تعینات بشکل کائنات نظر آرہا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ باری تعالیٰ کے سوا کوئی شئے حقیقی معنیٰ میں موجود ہی نہیں۔ صرف ذاتِ حق ہی موجود ہے اور باقی جو کچھ ہے وہ اسی وجود کے آثار و اظلال ہیں۔ شیخ محی الدین ابن عربی نے اس موضوع پر فتوحاتِ مکیہ جلد اول اور فصوص الحکم میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ خصوصاً وہ فص جس کا عنوان حکمۃ نفثیۃ فی حکمۃ شیثیۃ ہے اس میں انہوں نے اس پر کھل کر اظہارِ خیال کیا ہے۔ شیخ اکبر اور اُن کے ہمنوا حضرات نے کائنات، انسان اور خدا کے باہمی تعلق کو آئینہ کی مثال دے کر واضح کیا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ انسان تجلّی الٰہی کو اپنی حیثیت اور استعداد کے مطابق ہی دیکھ سکتا ہے۔ اس بنا پر وہ جب اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کرتا ہے تو درحقیقت باری تعالیٰ کی شان تنزیہ کو نہیں دیکھتا بلکہ خود اپنے آپ کو اُس میں منعکس پاتا ہے۔ دوسری طرف خود اللہ تعالیٰ اپنے اسماء اور اپنی صفات کا ظہور انسان میں دیکھتا ہے۔ اسی حقیقت کی شیخ اکبر نے ابو نواس کے مندرجۂ ذیل شعر کی مدد سے توضیح کی ہے۔

رق الزجاج ورقت الخمر
وتشاکلا فتشابها الامر
فکانما خمر ولا قدح
وکانما قدح ولا خمر

پیمانہ اور شراب دونوں لطیف ہو گئے اور دونوں باہم اس طرح مل جل گئے ہیں کہ امتیاز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باقی نہیں رہا۔ چنانچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شراب ہے اور پیالہ نہیں یا یوں کہیے کہ پیالہ ہے اور شراب نہیں۔
ایک مشہور شاعر نے اردو میں وحدۃ الوجود کے اس نظریہ کو یوں بیان کیا ہے :

تو آئینہ میں ہوں عکس، مَیں آئینہ تو ہے شخص
آئینہ جب اٹھا دیا، عکس و شخص کا فرق مٹا

یہ غالباً آئینہ اٹھنے اور عکس و شخص کا فرق مٹنے ہی کا نتیجہ تھا کہ حلاج نے انا الحق کا نعرہ بلند کیا اور ذات حق کے بارے میں عجیب و غریب تصورات پیش کیے۔ ہم یہاں صرف دو اشعار نقل کرتے ہیں :

سبحان من اظہر ناسوتہ
سر سنا لاھوتہ الثاقب
ثم بدا مستتراً ظاھراً
فی صورۃ الآکل الشارب[1]

"پاک ہے وہ ذات جس نے عالمِ ناسوت میں اپنے درخشاں لاہوت کی بلندیوں کے راز کو نمایاں کر دیا۔ پھر کھانے پینے والے انسان کی شکل میں علانیہ اور در پردہ جلوہ گر ہوا"

انسان اور اس کے خالق کے درمیان جو بنیادی فرق و امتیاز ہے اُسے حلاج انیت کا پردہ سمجھتا ہے اور اسے دُور کرنے کے لیے خدا سے یوُں دعا کرتا ہے :

بینی و بینک انی تزاحمنی   فارفع بحنک انی من البین

"میرے اور تیرے درمیان میری انیت حائل ہے۔ اے میرے پروردگار تیری ذات کی قسم تو جدائی اور بعد کی اس صورت کا تدارک فرما"

وحدۃ الوجود کے ان علمبرداروں کی پیروی میں بعض حضرات نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اگر انسان مجاہدہ اور ریاضت کرے تو وہ اس دنیا میں بھی باری تعالیٰ کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔ ان کے

---

[1] یہ اشعار امام ابن تیمیہ کی کتاب الحجج النقلیہ والعقلیہ سے نقل کیے گئے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نزدیک ایک اَن دیکھے خدا کی پرستش ایمان کی پہلی منزل ہے جس پر عاشقانِ ربانی کبھی قناعت نہیں کر سکتے۔ انہیں اس راہ میں مزید منزلیں طے کر کے وہ بلند و بالا مقام حاصل کرنا ہے جس میں روح ذاتِ حق کی تجلیات سے براہِ راست لطف اندوز ہو سکتی ہے۔

ذاتِ حق ایک بدیہی حقیقت ہے، اس سے کسی معقول انسان کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مگر شیخ اکبر اور اُن کے طرز پر سوچنے والے دوسرے بزرگ صرف اس اعتراف کو ایمان کے لیے کافی نہیں سمجھتے۔ اُن کے نزدیک ذاتِ باری تعالیٰ عوام الناس کے لیے مستور و محجوب ہے اور ان کی کم علمی کی بنا پر انہیں ایمان بالغیب کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے۔ باقی رہے خواص، یعنی اہلِ کشف، تو اُن کے لیے ذاتِ حق مشہود و محسوس ہے۔ شیخ اکبر ایمان بالغیب پر قناعت کرنے والوں کو آبِ شور کے طلبگاروں سے تشبیہ دیتے ہیں جس سے اُن کی روحانی پیاس کسی طور بھی بجھ نہیں سکتی بلکہ اسے مزید بھڑکاتی ہے۔ ان کے مقابلے میں اہلِ کشف و وجدان شیخ کی نظر میں آبِ شیریں کے طالب ہیں جس سے انسان صحیح معنوں میں روحانی تسکین حاصل کرتا ہے[۱]۔

مسلمان صوفیا نے وحدۃ الوجود اور ہمہ اوست کے متعلق جن افکار کا اظہار کیا ہے اور اُن کی تشریح و توجیہ میں دوسرے بزرگانِ امت نے جو کچھ فرمایا ہے اس پر کوئی تفصیلی گفتگو اس وقت ممکن نہیں۔ مجھے یہاں اس امر سے بھی کوئی بحث نہیں کہ ان حضرات کے یہ تصورات اسلام سے کس حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔ مجھے اس مقام پر یہ بتانا مقصود ہے کہ دنیا کے سارے مذاہب میں روحانیت کے پرستاروں نے ان حجابات کو دور کرنے کی کوشش جو انسان، کائنات اور خالقِ کائنات کے درمیان حائل ہیں اور وہ اس آرزو میں ہمت آزما رہے کہ غیب کے سارے پردوں کو درمیان سے ہٹا کر کسی طرح ذاتِ حق کا براہِ راست مشاہدہ کیا جائے تاکہ انہیں زیادہ سے زیادہ روحانی کیف و سرور حاصل ہو۔ اس قسم کی کوششوں سے مذہب کو کیا فوائد حاصل ہوئے اور انہیں کس قسم کے نقصانات برداشت کرنے پڑے اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

---

[۱] فصوص الحکم: فص حکمۃ احدیۃ فی کلمۃ ہودیۃ ص۱۱۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(د) خدا پرستی کے معاملے میں بگاڑ کی جو مختلف صورتیں پیدا ہوئیں ان میں ایک صورت انسان پرستی کی بھی ہے۔ اس کے پیچھے بھی وہی عوامل کارفرما ہیں جو غیر اللہ کی پرستش کے غلط تصور میں عام طور پر پائے جاتے ہیں۔

مذہب کے عناصر ترکیبی میں، جیسا کہ میں نے گذشتہ صفحات میں عرض کیا ہے ایک ضروری عنصر اُن بزرگ و برتر انسانوں کا بھی ہے جو باری تعالیٰ کے منشا اور ارادہ کو نوعِ بشری پر واضح کرنے کے لیے خود اس کی طرف سے مقرر کیے جاتے ہیں۔ انہیں چونکہ خداوند قدوس انسانوں کے لیے نمونہ اور مثال کے طور پر پیش کرتا ہے اس لیے یہ مقدس حضرات اپنے مالک پر گہرے ایمان و یقین، نوعِ بشری کے ساتھ اپنی غیر معمولی محبت، اور اسے راہِ راست پر لانے کے لیے بے پناہ خلوص اپنی بے داغ سیرت و کردار، اور اللہ تعالیٰ کے منشا کو دنیا میں نافذ کرنے کے لیے غیر معمولی تدبّر، تفکّر اور استقلال کا عملی ثبوت فراہم کرتے ہیں اور اس معاملے میں ان کی حیثیت بے مثال ہوتی ہے، اس لیے وہ ہر معاشرے میں اپنی الگ امتیازی حیثیت کی وجہ سے عام انسانوں میں نمایاں طور پر ممتاز دکھائی دیتے ہیں۔ پھر چونکہ باری تعالیٰ اپنی حجّت کو انسانوں پر قائم کرنے کے لیے اپنے ان بندوں کو بعض ایسے انعامات سے بھی نوازتا ہے جن سے عام آبادی کو سرفراز نہیں کیا جاتا، جیسے معجزات، اس لیے ان حضرات کا وجود انسانوں کے لیے حیرت کا موجب بن جاتا ہے۔ اور وہ ان کی پیروی کرنے کے بجائے ان کی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔ اللہ کے ان پاکباز بندوں کو جس قسم کی مشکلات اور دشواریاں پیش آئیں ان کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کے لیے انسانوں کو ایک اَن دیکھے خدا کے بندے بنانا، اپنی شخصیت کا پرستار بنانے کی بہ نسبت کہیں زیادہ مشکل اور صبر آزما کام تھا۔

ان مقدس نفوس کی پاکیزہ زندگیوں، ان کے اعلیٰ اخلاق، ان کے حیرت انگیز کارناموں، اور ان کے خدائے لم یزل پر نہایت پختہ اور محکم یقین کو دیکھ کر عوام کے لیے یہ باور کرنا مشکل تھا کہ ان پاکباز بندوں کا کوئی تعلق عام انسانی برادری سے بھی ہو سکتا ہے۔ ان کے دل و دماغ میں عجیب و غریب اُلجھنیں پیدا ہوتیں اور وہ حیران و ششدر ہو کر پوچھتے کہ آخر کسی انسان کے لیے یہ کیونکر ممکن ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ وہ اس اعلیٰ و ارفع مرتبہ پر پہنچ جائے۔ لازمی طور پر ان میں اُلوہیت کی شان موجود ہے۔ یا تو ذاتِ باری ان کے اندر خود حلول کر گئی ہے اور وہ ان کی شخصیت کے پردے میں خود سرگرمِ عمل ہے یا اس نے اپنی خدائی میں انہیں شریک ٹھہرا لیا ہے اور اپنی کبریائی کے کچھ حصّے انہیں تقسیم کر دیئے ہیں۔ لہٰذا انہیں خدا کے بندے سمجھ کر ان کی وساطت سے خدا کی معرفت حاصل کرنا خدا کی نعمت کو ٹھکرانا ہے۔ جب خود باری تعالیٰ غیب کے سارے پردے ہٹا کر ان مقدس ہستیوں کی شکل میں ان کے سامنے جلوہ آرا ہے تو انسان کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ ان مرئی خداؤں کو چھوڑ کر غیر مرئی خدا کے پیچھے نہ پڑے۔ جب منزلِ مقصود خود چل کر اُن کے پاس آگئی ہے تو پھر یہ بدنصیبی ہے کہ انسان اسے نشانِ منزل سمجھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ اس لیے اس کا فرض ہے کہ وہ اس موقع سے پُورا پُورا فائدہ اٹھائے اور ان محسوس خداؤں کے حضور میں سرِ نیاز جھکا کر وہ روحانی کیف و سرور حاصل کرے جو مذہب کا اصل مدّعا ہے۔ جو روحانی لذّت ایک شخص ذاتِ حق کو پیکرِ محسوس میں جلوہ گر دیکھ کر حاصل کر سکتا ہے وہ ایک اَن دیکھے خدا پر ایمان لانے سے کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ اس طرح لوگ خدا پرستی سے ہٹ کر انسان پرستی میں مبتلا ہوئے۔

انسان کی حیلہ جو فطرت نے بھی اکابر پرستی کے مسلک کو ہمیشہ تقویت پہنچائی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا راستہ چونکہ حق اور صداقت کا راستہ ہوتا ہے، جس کے نتائج اس دنیا کی سرحد کو عبور کر جانے کے بعد ہی سامنے آتے ہیں، اور انسان کو عمر بھر باطل کے خلاف نبرد آزما رہنا پڑتا ہے، اس لیے انسان نے حق کے اس کٹھن اور دشوار راستے سے گریز کے لیے یہ بہانہ تلاش کیا کہ ان بزرگ اور بلند تر ہستیوں اور عام انسانوں کے درمیان چونکہ ایک جوہری فرق ہے اس لیے وہ ان کی پیروی کے مکلّف ہی نہیں۔ ان کا کام صرف اسی قدر ہے کہ وہ ان کے مقامِ اُلوہیت کا صدقِ دل سے اعتراف کریں اور ان کے نام پر کچھ نذر نیاز دے کر یا ان کی تعریف و توصیف میں کچھ کلمات کہہ کر مطمئن ہو جائیں اور زندگی کے معاملات میں جس طریقے کو مادی اعتبار سے نفع مند سمجھیں اس پر چلتے رہیں۔ جن لوگوں کے مزاج پر مذہبیت زیادہ غالب تھی اور جنہیں دنیاوی علائق سے نفرت تھی اور وہ پُوری زندگی ان بزرگوں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساتھ روحانی ربط قائم رکھ کر بسر کرنا چاہتے تھے، انہوں نے اُن کے تصور میں اپنے آپ کو یکسر کھو دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین دار لوگ دنیاوی ذمہ داریوں سے بالکل غافل ہو گئے اور ان کی اس خود فراموشی سے طالع آزما دنیا داروں نے خوب فائدہ اٹھایا۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی پوری طرح ملحوظ خاطر رہے کہ لوگوں نے خدا کے ان نیک بندوں کی جو پرستش شروع کی تو اس کے لیے خود ان بزرگوں نے انہیں اس غلط کام کی قطعاً ترغیب نہ دی تھی۔ اس میں سراسر قصور ان لوگوں کا تھا جو اپنی روحانی تسکین و تشفی کے لیے کسی معبودِ مشہود کے طلبگار رہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جب اپنے معاشرے میں اپنے سامنے ایسے مقدس حضرات پائے جو فکر و نظر، جذبہ و احساس اور سیرت و کردار کے اعتبار سے بحرِ ظلمات میں مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے تھے تو انہوں نے اپنے دلوں کی تاریکیاں دُور کر کے اس نُور کی روشنی میں صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کے بجائے، اس نور کو معبود سمجھ کر اس کی پرستش شروع کر دی اور جس شخص نے بھی انہیں ان کی اس غلطی پر ٹوکا اس کے درپے آزار ہو گئے اور اسے بزرگوں کا دشمن سمجھ کر اُس کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔

خدا کے یہ پاکباز بندے اگر عوام الناس سے اپنی خدائی کا سکہ منواتے تو انہیں اتنی دقت پیش نہ آتی جتنی کہ انہیں خداوند تعالیٰ کی کبریائی تسلیم کروانے، اور اپنے آپ کو معبودِ حقیقی کے بندے اور اُس کے رسول منوانے میں پیش آئی۔ باری تعالیٰ کو پیکرِ محسوس میں جلوہ گر دیکھنے والے انسانوں کے لیے یہ قطعاً مشکل نہ تھا کہ وہ بوقتِ ضرورت اپنے معبودوں کی فہرست میں دو چار مزید خداؤں کا اضافہ کر لیتے۔

مذہب میں اس طرز کا جو بگاڑ پیدا ہوا اس کی ذمہ داری کسی طرح خدا کے ان پاک بندوں پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ لیکن جب مقدس ہستیاں دنیا سے رخصت ہوئیں تو معاشرے میں ان کے اعلیٰ و ارفع مرتبہ کو دیکھ کر، بعض دنیا داروں نے بزرگی کا لبادہ اوڑھ کر، ان کی جگہ سنبھالنے کی کوشش کی۔ لیکن چونکہ ان کے پیشِ نظر ان حضرات کی غیر معمولی عزت و احترام سے فائدہ اٹھا کر عوام میں اپنی خدائی قائم کرنا تھا اس لیے انہوں نے جان بوجھ کر لوگوں کو گمراہی اور ضلالت کے راستے پر ڈال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیا اور مذہب اور تقدیس کے نام پر لوگوں کو دل کھول کر لوٹا۔ انہوں نے اپنی غلط اور خلافِ مذہب حرکات کو صحیح اور برحق ثابت کرنے کے لیے تعلیماتِ الٰہی میں عجیب و غریب تحریفات کیں اور مذہب میں بعض ایسی بدعات کو فروغ دیا جنہوں نے اس کے پورے نظام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ اس ناپاک مہم میں دنیا دار علماء، دنیا پرست صوفیاء اور طالع آزما سیاست داں سبھی شامل تھے۔ انہوں نے مذہب کے اندر جتنا وسیع بگاڑ پیدا کیا اس کی نوعیتیں اتنی لاتعداد ہیں کہ ان صفحات میں اُن سب کا احاطہ ممکن نہیں۔ لیکن جب ایک انسان ان پر غور کرتا ہے تو وہ یہ بات بآسانی سمجھ لیتا ہے کہ ان سب کے پیچھے دوسرے ناپاک جذبات کے علاوہ جو جذبہ سب سے زیادہ مؤثر طور پر کارفرما رہا ہے وہ ایک ہی تھا کہ کسی طرح نظامِ مذہب میں نبی اور رسول کو جو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے اُسے ختم کرکے اُس کی جگہ خود سنبھال لی جائے اور جب لوگ اُس کی اطاعت کے کسی حد تک خوگر ہو جائیں تو پھر اُن سے بندگی کا مطالبہ کیا جائے۔

© rasailojaraid.com